R. No. 2196/57 | Regd. No. 922

انجمن ترقی اردو (ہند) کا پندرہ روزہ اخبار

ہماری زبان

Telephone No. 29

Telegrams "ANJUMAN"

جلد ۲۲ - شمارہ ۳ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | علی گڑھ - ۱۵ جنوری ۱۹۶۳ء

نادم سیتاپوری

ماہنامہ "آفتاب"

ریاض خیرآبادی، ظفر علی خاں اور حسرت موہانی وغیرہ کی طرح آغا شاعر دہلوی کے بارے میں بھی یہ فیصلہ ابھی تک نہیں ہو سکا کہ بحیثیت شاعر ان کی اہمیت زیادہ ہے یا بحیثیت ادیب، نثار، یا صحافی۔ ریاض کی خمریات نے "ریاض الاخبار"، "تار برقی"، "صلح کل"، اور "فتنہ" اور "عطر فتنہ" سے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ حسرت کے "اردوئے معلیٰ" کا ذکر بھی اب کم ہی سننے میں آتا ہے۔ غزل کے جدید تنقیدی زاویے ضرور کبھی کبھی حسرت کی عشقیہ و ادشعری صلاحیتوں کی داد دیتے ہیں، حالانکہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ بہت سی کروٹیں بدلنے کے باوجود ان کی بیش قیمت قربانیوں کے اذکار سے ابھی تک خالی نظر نہیں آتی۔ کم و بیش یہی حال ظفر علی خاں کا ہے جو اپنے دور کے مشہور ترجمہ نگار ہی نہیں، بلکہ بے تخلص شعرا کی صف اول میں اپنا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ صحافت انھیں ورثہ میں ملی تھی۔ زمیندار، دکن ریویو، افسانہ، "پنجاب ریویو" اور پھر "ستارۂ صبح" نے تو ایک زمانے میں ایسی دھوم مچائی کہ اقبال کی مثنویاں ایک اچھے خاصے ادبی معرکے کی زد میں آگئیں لیکن سیاست ان کا مقدر ہو چکی تھی "شیر پنجاب" پر فنا ہونا ان کا۔

افسر الشعرا آغا مظفر علی بیگ قزلباش شاعر دہلوی (۱۸۷۱ء - ۱۹۴۰ء) کی ادبی زندگی جس مد و جزر کا شکار رہی اسے آج بھی ایک مرکز پر قرار نہیں۔ رباعیات عمر خیام کا اردو ترجمہ تو خیر ان کا شاہکار ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے ڈرامے اور ناول بھی اپنے زمانے میں کچھ کم مقبول نہیں ہوئے! البتہ "آصف الاخبار"، "دہلی"، "حسن اردو" اور ماہنامہ "آفتاب" جنھیں آغا شاعر کی صحافتی زندگی کا ماحصل کہنا چاہیے اس طرح ہمارے ذہن و شعور سے محو ہوتے چلے جا رہے ہیں کہ چند روز میں ان کے دھندلکوں کا تصور بھی باقی نہ رہے گا۔ "دہلی"، "آصف الاخبار" اور "حسن اردو" کی فائلوں کا تو ذکر کیا! اب ایک شمارہ بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ یہی حال "آفتاب" کے پہلے دور کا ہے۔ شاید اس کے آخری دور کے کچھ پرچے کہیں محفوظ ہوں لیکن مجھے اب تک فراہم نہ ہو سکے۔ مجھے "آفتاب" کے دوسرے دور کی ایک نامکمل جلد "مدرسۃ الواعظین لکھنؤ" کے کتب خانے سے دستیاب ہوئی اور یہی اس مضمون کا سرچشمہ ہے۔

آغا شاعر دہلوی سوتیلی ماں کی بدسلوکیوں کا شکار ہو کر کم عمری میں اس طرح گھر سے نکلے کہ پھر تمام عمر اس گھر میں واپس نہ گئے۔ دلی چھوٹی، لاہور پہنچے اور پھر حیدرآباد دکن، بھوپال، لکھنؤ اور متعدد دیسی ریاستوں میں قسمت آزمائی کرتے رہے! مدتوں خواجہ حسن نظامی، سر عبدالقادر اور راشد الخیری وغیرہ کے ساتھ کام کرتے رہے۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد شاد کے دربار تک رسائی ہوئی لیکن وہاں بھی نہ جمے۔ آخرکار ۱۹۳۰ء سے کچھ پہلے راجپوتانہ کی ایک چھوٹی سی ریاست "جھالرا پاٹن" نے قدر افزائی کی۔ درباری شاعر کی حیثیت سے معزز کیے گئے مگر چند ہی روز میں "مہاراج" کی علم دوستی اور معارف پروری نے انھیں اپنا گرویدہ بنا لیا۔ انھیں اپنے فطری ذوق کی تکمیل کا ایک بار پھر موقع ملا اور ماہنامہ "آفتاب" کے دوسرے دور کا آغاز مارچ سنہ ۱۹۳۰ء سے ہوا۔

ماہنامہ "آفتاب" خود آغا شاعر کی ملکیت تھا جسے انھوں نے اپنے بڑے بیٹے "آغا آفتاب علی قزلباش" کے نام پر نکالا تھا لیکن جب یہ اپنی زندگی کے دوسرے دور میں داخل ہوا تو جھالرا پاٹن کے مہاراج رانا ہز ہائینس سر بھوانی سنگھ کو کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہو گئی کہ وہی سب کچھ نظر آنے لگے۔ "آفتاب" کے سرورق پر مہاراجہ کا نام

[illegible] "آفتاب" میں اس کا اشتہار چھپا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "حسن اردو" کا صرف ایک پرچہ شائع ہوا تھا۔

بحیثیت سرپرست چھپتا تھا اور "آفتاب" کا دفتر مہاراجہ بائن کے "قلعہ" میں قائم تھا۔ ریاست کے "سنٹرل جیل پریس" کے سپرد اس کی چھپائی وغیرہ کا انتظام تھا۔ مہاراجہ کے ذاتی اثر و رسوخ کی وجہ سے ہندوستان کی دیسی ریاستوں کے بہت سے فرمانروا اس کے مربی اور سرپرست ہو گئے تھے جن میں نظام دکن، مہاراجہ کشمیر، مہاراجہ بیکانیر، نواب بیگم بھوپال، مہاراجہ راج گڑھ، نواب ٹونک، مہاراجہ کھیلی پور، نواب جنجیرہ اور مہاراجہ کلیہ کے علاوہ دوسرے امراء اور جاگیردار بھی شامل تھے یہی نہیں بلکہ "آفتاب" کا حلقۂ اشاعت ہندوستان کے باہر تک پھیلا ہوا تھا چنانچہ ایک منظوم اعلان میں ان ممالک کے نام گنائے گئے ہیں جہاں یہ پرچہ جاتا تھا۔

چین، افریقہ اور جاوا کو یہ — تھوڑی سی عمر میں یہ جا پہنچا
جیتم ہر دو دن ہے بلند — ابھی رکھتا نہیں ہے یہ مانند
پھر سے الیسٹ پہ پڑتا اس کا — امریکہ، سیلیبز اور جاوا

(جولائی ۱۹۲۰ء)

محض "دامے درمے" ہی نہیں! بلکہ مہاراجہ کو "آفتاب" سے "قلمے اور سخنے" بھی کافی دلچسپی تھی۔ اس دوسرے دور کے جتنے پرچے میرے سامنے ہیں ان سب میں مہاراجہ کے مسلسل مضامین بالالتزام چھپے ہیں۔ مہاراجہ کے یہ مضامین اردو نثاری کے کامیاب نمونے نہیں ہیں بلکہ معلوماتی حیثیت سے انھیں اردو ادب میں ایک خاص جگہ حاصل ہے۔ یہ معلومات زیادہ تر سائنس کے ان زاویوں سے تعلق رکھتے ہیں جو پہلی جنگ عظیم تک انسانی ذہن و شعور کو منور و تاباں کر سکے تھے۔

جس زمانے میں "آفتاب" اپنی زندگی کے دوسرے دور میں داخل ہوا تھا اس وقت تک اردو زبان کے ادیب مختلف حلقوں میں تقسیم نہیں ہوئے تھے۔ گنے چنے چند لکھنے والے تھے جن کا تعاون حاصل کرنے کے لئے ہر رسالہ اور اخبار کوشاں رہتا تھا۔ "آفتاب" اپنی ہندوستان گیر شہرت کے لحاظ سے اس حلقے سے کافی قریب تھے۔ چنانچہ "آفتاب" کے لکھنے والوں میں اس عہد کا شاید ہی کوئی ادیب یا شاعر ایسا ہو جو شامل نہ ہو۔ خواجہ حسن نظامی، راشد الخیری، سجاد حیدر یلدرم، آغا حیدر دہلوی، علامہ برج موہن کیفی دتاتریہ، علامہ نظم طباطبائی، احسان اللہ خاں گوہر گورکھپوری، ڈاکٹر اقبال، اکبر الہ آبادی، ریاض خیرآبادی، مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، رضا علی وحشت، قاضی محمد محسن، ضیا سیتاپوری، عزیز لکھنوی، نوح ناروی، اسمٰعیل میرٹھی، مہاراج بہادر برق دہلوی اور پیارے لال رونق دہلوی وغیرہ۔

صحافتی تجربے کے اعتبار سے "آفتاب" بھی اپنے دور کے معاصرین کی طرح حصۂ نثر اور حصۂ نظم میں تقسیم تھا۔ ہر شمارے میں تین عنوان مستقل تھے۔ "پہلی کرن" جسے "افتتاحیہ" کہنا چاہئے اور "نصف النہار" جس میں دوسروں کے مضامین رہتے، تیسرا "دھوپ چھاؤں"۔ حصۂ نظم میں عام طور سے غزلیں، نظمیں یا اور ایسی ہی منظوم تخلیقات! آخر میں چند صفحات معمولی کاغذ پر ہوتے تھے جن میں رسالے کے اغراض و مقاصد اور اسی قسم کی بعض چیزوں کے علاوہ اشتہارات شائع کئے جاتے تھے۔ رسالے کی ضخامت عام طور سے تیس صفحات ہوتی تھی سرورق اور معمولی صفحات کے علاوہ۔۔۔!

اس دوسرے دور (۱۹۲۰ء) کے جو دس شمارے میرے پیش نظر ہیں ان میں مارچ سنہ ۱۹۲۰ء کا شمارہ پہلا پرچہ ہے جس پر جلد ۵ شمارہ ۱ پڑا ہوا ہے۔ اس نمبر میں ایک خاص مضمون "توپ" مہاراجہ بہادر بائن کا ہے دوسرا خواجہ حسن نظامی کا۔ نظم کے حصے میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، اکبر الہ آبادی، پروفیسر مہدی حسن ناصری اور مرزا عاشق حسین بزم اکبرآبادی وغیرہ کی غزلیں ہیں۔

اپریل ۱۹۲۰ء سے اس کی دوسری جلد بدل گئی لیکن اس جلد نمبر پانچ پر شمارہ نمبر ایک کے بجائے "چار" پڑا ہوا ہے جو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس مہینے کے مضامین میں سب سے اہم مضمون "اردو کی انشاء دور جدید میں" علامہ کیفی دہلوی نے ان رجحانات کی مخالفت کی ہے جو اردو زبان میں "وضع اصطلاحات" کی تحریک کے تحت غیر مانوس الفاظ کو شامل کرنے کے موید تھے۔ علامہ کیفی کا نظریہ یہ تھا کہ اردو زبان میں جو الفاظ جس طرح بہ زبان زد خاص و عام ہو چکے ہیں انھیں بدستور اپنی جگہ پر قائم و برقرار رکھا جائے خواہ وہ عربی سے لئے گئے ہوں یا سنسکرت، فارسی یا اور کسی زبان سے۔ اس سلسلے میں علامہ کیفی نے حیدرآباد دکن کی "تحریک وضع اصطلاحات" کو اردو زبان کی ترقی میں ایک طرح سے رکاوٹ قرار دیا ہے۔ تحریر فرماتے ہیں علامہ کیفی:۔

"...ابھی تھوڑا عرصہ ہوا "عثمانیہ یونیورسٹی" کے مختلف شعبوں کی ترتیب و تدوین کی ذیل میں اصطلاحات علوم طبعیات کے متعلق حیدرآباد دکن میں بڑی بحث ہوئی۔ ایک فریق کے وکیل مولانا علی حیدر نظم طباطبائی حیدر یار جنگ تھے۔ آپ باوجودیکہ عربی فارسی کے جید عالم ہیں۔ لیکن آپ کا قول یہ تھا کہ اگر ایک لفظ انگریزی کا ایک شے کے لئے مقرر ہے تو اسی کو اردو میں استعمال کرنا بہتر ہے بمقابلہ اس کے کہ عربی کا ایک سطر کا فقرہ گھڑا جائے... ہندی والوں نے بڑی عقل مندی کی۔ پنڈتوں کی ایک ٹانی اور بہت سے اصطلاحی لغت یا ترکیبیں جن کی آواز کانوں کو ناگوار نہ تھی اور جن کا قائم مقام غیر مانوس سنسکرت لغت یا فقرہ تھا عوام کے توڑ اپنی علمی فرہنگ میں داخل کر لئے" (بحوالہ ہندی ساختک گلاسری، مرتبہ ناگری پرچارنی سبھا بنارس)

علامہ کیفی کا یہ مضمون آج سے چالیس برس ادھر کے منصفانہ لسانی نظریات کا ترجمان ہے۔ ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کی الجھی ہوئی لسانی گتھی سلجھانے کے لئے اگرچہ آج بھی باتیں اسی قسم کی جاتی ہیں۔ مگر عمل اس کے برعکس! آج نہ گاندھی جی کے لسانی نظریات کی کوئی اہمیت ہے نہ خود ناگری پرچارنی سبھا اپنے نظریات کی پابند! آزادی کے بعد تو ہندوستان میں جو زبان جنم دی جا رہی ہے اسے خود وہ لوگ نہیں سمجھ سکتے جو بزعم خود اس کے "خالق" ہیں۔

(باقی صفحہ ۵ پر)

مشرق کے نیستاں میں ہے محتاجِ نفس نے
شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
(اقبال)

ہماری زبان

۱۵/جنوری ۱۹۷۳ء

ہمارے مشاعرے

جب کوئی غیر ملکی ہمارے کسی مشاعرے میں شرکت کرتا ہے تو اُسے بڑی حیرت ہوتی ہے۔ مغرب میں شاعر اپنا کلام رسالوں میں چھپواتا ہے یا پھر مجموعے کے ذریعے ادبی حلقوں سے روشناس ہوتا ہے۔ کبھی کبھار دوستوں کو اپنی نظمیں سُنا لیتا ہے یا کسی ادبی حلقے میں اُسے چند سامعین مل جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف ہندوستان اور پاکستان میں ہر مشاعرے میں کئی درجن شاعر جمع ہوتے ہیں اور کئی ہزار آدمی بڑے ذوق و شوق سے اُن کا کلام سُنتے ہیں اور خوب خوب داد دیتے ہیں۔ غیر ملکی مہمانوں پر ان سب باتوں کا بڑا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ ہمارے شعرا پر رشک کرنے لگتے ہیں کہ اُن کے سُننے والے ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور وہ اپنے خیالات سے اتنی بڑی تعداد کو متاثر کر سکتے ہیں۔

لیکن غور سے دیکھا جائے تو آج کل کے مشاعروں میں شاعری کے کمال کا کم اور گلے بازی یا ایک صاحب کے الفاظ میں چٹ پٹے شعروں کا مظاہرہ زیادہ ہوتا ہے۔ ایک طرف ہمارے شاعر ہیں جو زیادہ تر غزل کی ایمائی زبان برتتے ہیں حالانکہ سُننے والوں کا بڑا حصہ اس لطیف دنیا سے بے بہرہ ہوتا ہے، دوسری طرف سُننے والے شعر سُننے کم آتے ہیں، وہ گانا سُننے آتے ہیں یا فلم دیکھنے کے بجائے مشاعرے میں شرکت کر لیتے ہیں۔ ان لوگوں کو ایسے اشعار سے دلچسپی ہوتی ہے جن میں حسن و عشق کے ترانے گائے جائیں یا سیاسی موضوعات جذباتی انداز میں پیش کئے جائیں، مشاعروں کا انتظام کرنے والے شعر و ادب سے زیادہ سیاسی یا سرکاری مقاصد سے سروکار رکھتے ہیں۔ وزیروں کے لئے عوام سے تعلق رکھنا ضروری ہے۔ اس لئے وزیر ہمیشہ اس کے لئے تیار رہتے ہیں کہ کسی کتب خانے کی عمارت بننے کے موقع پر، یا کسی قومی رہنما کے جنم دن پر صدارت کر دیں، یا کسی مشاعرے یا کوی سمیلن کا افتتاح کر دیں۔ افتتاح کے موقع پر اُردو شاعری کی کچھ تعریف بھی ہو جاتی ہے، کچھ اُردو زبان کی شیرینی کا بھی تذکرہ ہو جاتا ہے۔ پبلسٹی والے ان کلمات کو تبرک سمجھ کر جلی سُرخیوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ ہم اُردو والے انہیں کو پڑھ کر خوش ہو لیتے ہیں۔ صدر بھی عام طور پر کوئی وزیر یا سرکاری افسر ہوتا ہے اور اگر بدقسمتی سے اُسے اُردو شاعری سے دلچسپی ہے تو نیچے کے افسر ہر نمائش کے موقع پر، ہر عُرس میں، یومِ آزادی پر کسی تہوار کے سلسلے میں مشاعرہ ضرور کرتے ہیں۔ ہمارے ملک میں عام طور پر کسی کام کے لئے اُس سے حقیقی دلچسپی ضروری نہیں، ہاں اگر اس کام سے آئندہ کچھ ذاتی نفع کی امید ہو تو وہ کام ضرور کیا جاتا ہے۔ غرض ایسے ایسے مشاعرہ بازوں کی وجہ سے ان مشاعروں کی خاصی مٹی پلید ہوتی ہے۔ پھر وہ شعرا جو کچھ مشہور ہو گئے ہیں ان مشاعروں میں اپنی پُرانی اور بار بار کی پڑھی ہوئی غزلیں یا نظمیں پڑھتے ہیں۔ ہر شاعر یہ خیال رکھتا ہے کہ دوسرا مقبول نہ ہونے پائے۔ کچھ شاعر مشاعرے میں شرکت کرنے آتے ہیں تو شاعری کے ساتھ اپنے اخلاق کا مظاہرہ بھی کرتے چلتے ہیں۔ اُن کے معمولات عین محفل میں پورے ہونے چاہئیں ورنہ وہ خفا ہو جائیں گے۔ یہ معمولات ایسے ہوتے ہیں جن پر بہت سے لوگوں کو بجا اعتراضات ہوتے ہیں۔ آج کل کے سامعین میں خواتین خاصی تعداد میں ہوتی ہیں اور کچھ شاعرات اپنا کلام بھی سُناتی ہیں۔ یہ اچھی بات ہے مگر ان کی موجودگی میں جس سنجیدگی اور تہذیب کی ضرورت ہے اُس کا لحاظ کم ہی رکھا جاتا ہے۔ یار لوگ فقرے کستے ہیں۔ کبھی کبھار کچھ شعرا بھی ایسی نظمیں پڑھتے ہیں جو کسی طرح مناسب نہیں کہی جا سکتیں۔ پھر سامعین کا بڑا حصہ فارسی سے بالکل ناواقف ہوتا ہے اور اُردو شاعری کی زبان پر اب بھی فارسی کا گہرا اثر ہے۔ ترکیبیں، تلمیحیں، تشبیہیں، استعارے اکثر فارسی کی کچھ شُد بُد کا مطالبہ کرتے ہیں جو سُننے والوں کی اکثریت میں ناپید ہے۔ ان سب باتوں نے مل کر ایک افراتفری پیدا کر دی ہے مشاعروں میں سُننے والوں کی تعداد تو بڑھ رہی ہے، مگر ان کی افادیت کم ہو رہی ہے اس لئے ان کی اصلاح نہایت ضروری ہے۔

ہمارے خیال میں اب ہر مشاعرہ ٹکٹ سے ہونا چاہئے جو لوگ اچھے شعر سُننے چاہتے ہیں وہ اس کی مناسب قیمت ادا کریں۔ مشاعروں میں شاعروں کی تعداد ہمیشہ منتخب ہونی چاہئے۔ یہ اگر بیس پچیس سے زیادہ نہ ہو تو بہتر ہے۔ یہ تین گھنٹے سے زیادہ نہ چلیں تو بہتر ہو۔ ان کا صدر ادبی حیثیت رکھتا ہو شعرا کا تعارف کرنے والے سستی مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش نہ کریں اور خواہ مخواہ فقرے بازی سے کام نہ لیں۔ شعرا جہاں تک ہو سکے تازہ کلام سُنائیں۔ اُن لوگوں کی ہمت افزائی نہ کی جائے جو شعر بہت معمولی کہتے ہیں ہاں گلا بہت اچھا پایا ہے۔ وہ بھی قابلِ قدر ہیں مگر ان کی جگہ دوسری ہے۔ شاعر بدلتی ہوئی دنیا کا شعور پیدا کریں اور ایسی زبان استعمال کریں جو سامعین کی سمجھ میں آ جائے اور وہ اس سے لُطف لے سکیں۔ یہ سمجھنا غلط ہے کہ بول چال کی زبان میں شعریت نہیں ہے۔ ادبی زبان اور بول چال کی زبان میں فرق تو ہوتا ہے مگر جتنا فرق ہمارے یہاں ہے وہ ہماری شاعری کو اور مقبول نہیں ہونے دیتا۔ اچھا مشاعرہ منتظمین کے سلیقے، شعرا کے ذمہ داری کے احساس اور سامعین کے ضبط و نظم تینوں سے وجود میں آتا ہے

اردو دوستوں کے پاس عوام سے تعلق کا یہ ایک اچھا آلہ تھا۔ ہم اپنی غیر ذمے داری کی وجہ سے اسے مسخ کر رہے ہیں۔ ابھی اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اگر اب بھی توجہ نہ کی گئی تو یہ قوالی اور دنگل کی قسم کی ایک سستی تفریح ہو کر رہ جائے گا۔ ادب کی بنیاد تہذیب پر ہوتی ہے اور اسی لئے اس ادبی ادارے کو ایسی مسرت کا گہوارہ ہونا چاہیئے جو اپنے ساتھ بصیرت بھی لائے اور جو سننے والوں کے جمالیاتی، اخلاقی اور سماجی شعور کو بیدار کرے۔ دیکھنا ہے کہ اس فرض سے کون کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔

انجمن ترقی اردو شاخ بودھن

انجمن ترقی اردو شاخ بودھن مستقر شکر نگر کے قائم کردہ دار المطالعہ میں چار ماہانہ رسالے، اٹھارہ پندرہ روزہ، پانچ ہفتہ وار، ایک سہ روزہ اور چار روزنامے آتے ہیں۔

سنہ ۱۹۶۲ء کے دوران میں بودھن و شکر نگر کے (۵۰۰) افراد نے ان اخبار و رسائل اور کتابوں سے استفادہ کیا ہے۔ (مستعد)

"اردو مجلس" حیدرآباد

اردو مجلس حیدرآباد کا ماہانہ ادبی جلسہ ۱۸ جنوری کو اردو ہال میں منعقد ہوا۔ ڈاکٹر بی رام کشن راؤ ایم پی سابق گورنر یوپی نے اجلاس کی صدارت کی۔ مسٹر محمد منظور احمد معتمد اعزازی اردو مجلس نے صدر جلسہ کا خیر مقدم کرتے ہوئے ان کی گل پوشی کی۔ اس ادبی اجتماع میں ممتاز مزاح نگار شاعر مرزا شکور بیگ کے مجموعہ کلام "ترانے" کی رسم اجرا ڈاکٹر بی رام کشن راؤ کے ہاتھوں انجام پائی۔

پروفیسر ابو ظفر عبد الواحد نے "مرزا شکور بیگ" کے بہ عنوان اپنے دل چسپ مضمون میں کہا کہ "مرزا ایک شگفتہ مزاج شاعر اور جوان ظریف ہی نہیں ایک باراں دیدہ وکیل بھی ہیں۔ چنانچہ ان کی وکالت اور قانونی موشگافیوں نے ان کی ظرافت و شاعری میں چار چاند لگا دیئے۔ اپنی شگفتہ مزاجی کے باوصف مرزا شکور بیگ ایک حساس اور سنجیدہ فن کار ہیں۔ انکی نشتر کاری میں اکبر الہ آبادی کی طرح تیکھا پن ملتا ہے۔ اور اکبر کی طرح مرزا جی ایک خاص قسم کی ملمع کاری بھی خوب کرتے ہیں، اور افرنگی بندوں کو اردو کے خراد پر بڑے ہی سلیقے سے چڑھاتے ہیں۔"

صدر جلسہ ڈاکٹر بی رام کشن راؤ نے مرزا کے فن اور ان کی شخصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ "مرزا شکور بیگ اور میں یونین اور پلیڈری سے لے کر اداکاری کے کاموں میں بھی ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ ان کی شگفتگیٔ طبع اور ظرافت نے اسمبلی کے علاوہ دیگر مقامات پر بھی ہم سبھوں کو محظوظ کیا ہے۔"

ابتدا میں کرسیٔ صدارت سے حیدرآبادی تہذیب کے علم بردار اور اردو سے والہانہ محبت رکھنے والے راجہ پرتاب گیر جی کے سانحۂ ارتحال پر ایک قرارداد تعزیت پیش کی گئی جسے حاضرین نے استادہ ہو کر دو منٹ کی خاموشی کے ساتھ منظور کیا۔

(وقار خلیل)

انجمن معین الادب سہسرام

انجمن معین الادب سہسرام کا ماہانہ جلسہ زیر صدارت سید عبد السلام افسر سہسرامی منعقد ہوا جس میں اراکین انجمن نے مقامی رام اجین کنیا ہائی اسکول اور ہزاری مل رنگلٹا مڈل اسکول کے طریقۂ امتحانات پر اظہار افسوس کیا کہ امتحانات کے سوالات صرف سخت ہندی زبان اور رسم الخط ہی میں چھپتے ہیں جن سے ان طلباء و طالبات کو جن کی مادری زبان اردو ہے سوالات کو سمجھنے اور ان کے جوابات لکھنے میں دقتیں پیش آتی ہیں۔

ہندوستان کے دستور نے لسانی اقلیتوں کو یہ حق عطا کر رکھا ہے کہ ان کی ابتدائی تعلیم ان کی مادری زبان میں دی جائے۔ انجمن کے خیال میں سوالات کا صرف ہندی زبان میں چھپنا اس حق کی نفی ہے۔ اس لئے یہ انجمن پرزور الفاظ میں مطالبہ کرتی ہے کہ آئندہ سے امتحانات کے سوالات اردو زبان میں بھی چھپیں۔

(تمنا سہسرامی)

رسالہ جامعہ کا جائزہ نمبر

ماہنامہ جامعہ کا جائزہ نمبر اپریل سنہ ۱۹۶۳ء میں شائع ہوگا، اس میں سنہ ۱۹۶۲ء کی اردو مطبوعات کی فہرست شائع کی جائے گی اور تمام اصناف ادب کا الگ الگ جائزہ لیکر بتلایا جائے گا کہ سنہ ۱۹۶۲ء میں اردو ادب کی رفتار ترقی کیسی تھی۔

(عبد اللطیف اعظمی)

معجز سہسوانی کا انتقال

۶ اور ۷ جنوری کی درمیانی رات میں سہسوان کے ممتاز عالم، ادیب و شاعر حکیم سید اعجاز احمد صاحب معجز کا انتقال ہو گیا، ان کی پیدائش سنہ ۱۸۸۴ء میں ہوئی تھی۔ سنہ ۱۹۱۹ء سے سنہ ۱۹۴۴ء تک وثیقہ عربک کالج فیض آباد کے وائس پرنسپل رہے۔ انھوں نے پچاسی سال کی زندگی میں تقریباً ایک درجن مذہبی و ادبی کتابیں تصنیف و تالیف کیں۔ ابتدائی کلام کا ایک مجموعہ "معجز نما" دو ناول "پردۂ راز" اور "جاریۂ عرب" تنقیدی مضامین کا ایک مجموعہ "نقد و انتقاد" اور "مومن و غالب" کے نام سے دونوں اساتذہ کے کلام کا ایک موازنہ جو کہ آپ کے ان کارناموں میں شامل ہیں جو چھپ چکے ہیں۔

(حنیف نقوی سہسوانی)

علی افسر حیدر آباد

قومی دفاعی فنڈ

میرے جذبات، صداقت کے سوا کچھ بھی نہیں
میرے الفاظ، حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
دلِ شاعر میں محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
مال و زر ہوتا وطن کے لئے میں بھی دیتا
خونِ دل اپنا چمن کے لئے میں بھی دیتا
میں تہی دست سہی خونِ جگر دیتا ہوں
اپنا فن، اپنی نظر، اپنا ہنر دیتا ہوں
مستِ امروز کو فردا کی خبر دیتا ہوں
دشمنِ امن و اماں تاک میں بیٹھا ہے ابھی
ایک شعلہ خس و خاشاک میں بیٹھا ہے ابھی
کس بھلائی کی توقع کریں مکاروں سے
مل گیا ہم کو سبق چین کے عیاروں سے
مجھ کو کہنا ہے یہ بھارت کے پرستاروں سے
ایک للکار ابھی وقت کی آواز میں ہے
دوستو! جنگ ابھی منزلِ آغاز میں ہے
فرض ہے ہم پہ کریں آج وطن کی خدمت
اپنے ہی ہاتھ میں ہے اپنے وطن کی عزت
وقت کے بعد نہ کام آئے گی اپنی دولت
ملک پر اپنا زر و مال نچھاور کر دیں
بھائیو! ہند کا پھیلا ہوا دامن بھر دیں
اب ضرورت ہے فصیلوں کی نہ دیواروں کی
جنگ یہ جنگ نہیں ہے کوئی تلواروں کی
جنگ درکار ہے اب مانگ ہے ہتھیاروں کی
اپنی فوجوں کو نئے سے نئے ہتھیار ہوں اب
سونے والوں سے یہ کہنا ہے کہ بیدار رہیں اب
جنگِ ہندی ہے صداقت کا پیمانہ دیکھو
یہ حقیقت بھی ہے یا کوئی فسانہ دیکھو
آگے کس راہ پہ چلتا ہے زمانہ دیکھو
جلنے والے تو چلے چاند ستاروں کی طرف
اور ہم دیکھ رہے ہیں ابھی غاروں کی طرف
رخصت اے ہند کہ اب ذہن میں آتا ہے یہی
بھیجو ڈھولا یہ حق اپنا جتانا ہے یہیں
ملک کو پنجۂ دشمن سے بچانا ہے یہیں
زر دار ہو تو ہر اک فرض ادا ہوتا ہے
صرف بے کار سے نا چیز سے کیا ہوتا ہے
امن دشمن کے تسلط کو ہٹانے کے لئے
مادرِ ہند کی عزت کو بچانے کے لئے
مال و زر چاہئے طاقت کو بڑھانے کے لئے
آج ایثار کرو گے تو صلہ پاؤ گے
ورنہ تم صفحۂ تاریخ سے مٹ جاؤ گے

رحمٰن جامی

اہلِ طوفاں

زندگی کے طوفاں میں کب سے ہوں تہ و بالا
اب مجھے کنارا بھی دور ہی سے تکتا ہے
جی میں یوں بھی آتا ہے تہ میں ڈوب ہی جاؤں
رات دن کی وحشت سے جاں تو چھوٹ جائے گی

لیکن ایسے لمحوں میں مجھ کو بے کراں موجیں
ناز و دلربائی سے لطف اور عنایت سے
بانہوں پر اٹھاتی ہیں دور لے کے آتی ہیں
اور پٹک کے ساحل پر مضحکہ اڑاتی ہیں

سوچتا ہوں طوفاں ہی مجھ کو راس آیا تھا
جیسے مرحلہ بے تھیں میری ہم نوا موجیں
لیکن اب میں ساحل پر یوں بھٹکتا پھرتا ہوں
جیسے کوئی آوارہ ایک عاشقِ رسوا

آؤ مجھ کو اے موجو پھر اٹھا لو بانہوں پر
اب مری یہی ضد ہے زندگی سے ٹکراؤں
خود اٹھاؤں اک طوفاں دیکھوں اس کا نظارہ
اب مجھے کنارہ بھی غیر غیر لگتا ہے

غزلیں

مسعود اختر جمال

یوں ہی چپکے چپکے رونا یوں ہی دل ہی دل میں باتیں
بڑی کش مکش کے دن ہیں بڑی الجھنوں کی راتیں
ہے نفس نفس فروزاں ہے مژہ مژہ چراغاں
بڑی دھوم سے اٹھی ہیں غم و درد کی براتیں
مرے ذہن کے خلا میں مرے دل کی وسعتوں میں
کہیں رنگ و بو کے خیمے، کہیں نور کی قناتیں
انہیں اے غمِ زمانہ کبھی رائیگاں نہ کرنا
ہیں بہت لطیف و نازک غمِ دل کی وارداتیں
یہ جمالِ میکدہ ہے، نہیں یاں کوئی تکلف
نہ عرب عجم کے جھگڑے، نہ حسب نسب نہ ذاتیں

گووند پرشانت

اے جانِ تبسم تری معصوم ادا نے — لب ہائے زمانہ پہ تراشے ہیں فسانے
ممکن ہے کہ اب آپ کو میں نے ہی بھلایا — پھر موڑ دکھائے ہیں مرے ذہن رسا نے
شاید ہے زمانوں کو نگاہوں سے تری ربط
دھڑکن میں نگاہیں تو بدلتے ہیں زمانے

بقیہ: ماہنامہ آفتاب

علامہ کیفی کے اس مضمون کے علاوہ مہاراجہ کے اسی مضمون (توپ) کی بقیہ قسط اور ایرانی سفیر نواب نصیر الممالک کے سفر نامہ دہلی کی ایک قسط بھی ہے۔ حصہ نظم میں اکبر الہ آبادی کے "دو قطعے" اور ڈاکٹر اقبال کی ایک نظم "آفتاب حقیقت" (جو "رگ وید" کی مشہور دعا "گائتری" کا ترجمہ ہے۔ اس اردو نظم میں دس شعر ہیں۔ ان کے علاوہ "حضرت دل" قاضی محمد محسن وفا سیتاپوری کی ایک نظم اور فتنہ سند یلوی کی ایک فارسی نظم بھی ہے۔

مئی سنہ ۱۹۲۰ء کے مضامین کی فہرست درج ذیل ہے۔

۱۔ پہلی کرن ۔ یاد وطن آغا شاعر (ایڈیٹر)
۲۔ دربار ہولی
۳۔ یضعف النہار (اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے)، راشد الخیری دہلوی ۔
۴۔ دیس اچھا یا پردیس، سید سجاد حیدر یلدرم ۔
۵۔ گوشہ کلاہ دہقاں بہ آسماں رسید آغا شاعر (ایڈیٹر)
۶۔ توپ، مہاراجہ جھالراپاٹن ۔
۷۔ دھوپ چھاؤں ۔ دو خط ۔ نذیر احمد خاں صاحب بی ایس سی
۸۔ سکۂ زر ۔ آغا شاعر دہلوی

حصہ نظم میں اکبر الہ آبادی کی نظم "مغربی پھول" کے دس اشعار، اور دوسرا قطعہ ڈاکٹر اقبال کا ہے جو "علی برادران" کی رہائی پر کہا گیا تھا اس قطعہ میں صرف چار شعر ہیں۔

سے اسیری اعتبار افزا جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندان صدف سے ارجمند
مشک اذفر چیز کیا ہے؟ اک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے ہو کر نافۂ آہو میں بند
ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دام و قفس سے بہرہ مند
شہپر زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
کیں سعادت قسمت شہباز و شاہیں کردہ اند

غزلوں میں مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، جلیل، ریاض، نواب شجاع الدین احمد خاں تاباں دہلوی اور خود آغا شاعر کی غزل شامل ہے۔ فصاحت یار جنگ جلیل کو "مانک پوری" کے بجائے "لکھنوی" اور "ریاض خیر آبادی" کو "گورکھپوری" لکھا گیا ہے۔

آغا شاعر کا مضمون "یاد وطن" دلی کی با محاورہ اردو کا ایک مثالی نمونہ ہے۔

جون سنہ ۱۹۲۰ء کے شمارے میں نظم طباطبائی، سید سجاد حیدر یلدرم، احسان اللہ خاں گورکھپوری اور خود آغا شاعر کے تین مضامین شامل ہیں۔ آغا شاعر کا مضمون "مغربی روشنی میں اردو کا دور جدید" اردو ادب کی تاریخ کا ایک کامیاب تجزیہ ہے۔

"دور ششم" کے چند سرسری خاکے ملاحظہ ہوں:۔

"یہی وقت تھا جب علی گڑھ میں سر سید احمد خاں جیسا کوہ شکن انجینیر جہاں مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے مانوس کرنا چاہتا تھا وہیں وہ اردو کی نئی داغ بیل بھی ڈال رہا تھا۔ بیل اور سرچشمے قائم ہو رہے تھے نواب محسن الملک، سعدیٔ اردو مولوی الطاف حسین حالی علامہ شبلی نعمانی، ڈاکٹر نذیر احمد خاں، ایل ایل ڈی اور مولوی ذکاء اللہ خاں جیسے مورخ و سخن طراز اس کے ہم بزم و ہم خیال تھے۔ جہاں جو "تہذیب الاخلاق" کے صفحے رنگے جانے لگے اور ان بزرگوں کی گرانمایہ اور عدیم المثال تصانیف سے اردو کا خزانہ مالا مال ہو گیا۔۔۔ نظم کا میدان اس زمانے میں جہاں استاد جلیل ہندوستان نواب مرزا خاں صاحب داغ دہلوی، منشی امیر احمد صاحب مینائی، حکیم سید ضامن علی صاحب جلال لکھنوی، حکیم ظہیر، مجروح، منشی امیر اللہ تسلیم اور شہزادہ ارشد گورگانی تک وسیع ہو گیا تھا۔ مذہبی واقعہ نگاروں میں میر نفیس، میر انیس ثانی جناب مرزا اوج مرحوم اور جناب رشید مرحوم یادگار ناظم مانے گئے۔"

"زندہ دلان پنجاب" کے تحت اسی مضمون میں پنجاب کی ادبی اور صحافتی سرگرمیوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے:۔

"یہ لوگ مغربی علوم کی جھلکیاں دیکھ ہی چکے تھے اب مشرقی رنگ کو بھی سمو لیا اور دو آتشہ جام رنگی کے دور پر دور چلنے لگے۔ ہاں البتہ اگر ان میں کچھ کور کسر تھی تو صرف اتنی ہی کہ اردو کے بیش تر محاورات سے نا واقفیت موقع اور محل سے نابلد، تذکیر و تانیث سے اجنبی، اونچی پونجی اور شوق زیادہ، مگر ہمت کا قدم آگے تھا اس نے کسی کی پروا نہ کی۔ شارٹ ہینڈ (Short hand) ہونا قبول کیا مگر کام کرنے پر تل گئے۔ رفتہ رفتہ درس و تدریس سے افہام و تفہیم کی منزلیں طے کرتے ہوئے اخباری معلومات پر قادر ہو گئے۔ رسائل نگاری شروع کر دی۔ آخر اس طوفان کا یہاں تک دل بندھا کہ ایک اکیلے لاہور سے صرف ایک وقت میں ایک سو اخبار اور رسالے نکلنے لگے اور کتنا جتنی ناشرو ناظم برسات کی دیدگی کی طرح کان پر قلم رکھے ملک میں جہاں تہاں گشت لگانے لگے۔۔۔ یہ قاعدے کی بات ہے پانچوں انگلیاں یکساں نہیں ہوتیں۔ انھیں میں سے بکا یک، اک نو تعلیم یافتہ نوجوانوں کی پارٹی ایسی بھی نکل آئی جس نے حقیقت کو پہچان لیا اور ضرورت زمانہ کے موافق ادب اردو کی ترقی کے لئے "مخزن" جیسا میگزین نہایت قابلیت اور خوب صورتی کے ساتھ جاری کر دیا۔ خان بہادر شیخ عبد القادر بی اے اس کے راس الرئیس بنے۔ علامہ ڈاکٹر اقبال ایم اے

جیسا حقیقت نگار اس کا مدد گار۔ سید سجاد حیدر بی۔ اے
(یلدرم) مولوی غلام بھیک نیرنگ وغیرہ جواں خیال و
جواں اقبال نامہ نگاروں نے اسے چند ہی سال میں ماہ وار
دس ہزار نگاہوں سے گذار دیا۔

"مخزن" کی تعداد اشاعت کے بارے میں آغا صاحب کی اطلاعات یقیناً مبالغہ آمیز نہیں کہی جا سکتیں۔ کیونکہ "مخزن" اور سر عبدالقادر سے ان کے بہت ہی قریبی تعلقات تھے۔ آغا صاحب کا پہلا مجموعہ کلام "تیر و نشتر" ۱۹۰۱ء میں پہلی مرتبہ "مخزن" ہی نے شایع کیا تھا۔ "آفتاب" کا یہ دلچسپ مضمون جون سے اگست ۱۹۲۰ء تک مسلسل تین قسطوں میں چھپتا رہا۔ جولائی کے شمارے میں اُردو ادب اور صحافت کے نئے اُتار چڑھاؤ پر بہت ہی بھرپور انداز میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اور اس تنقید سے مولانا ابو الکلام آزاد کا وہ مخصوص اسلوب نگارش بھی نہ بچ سکا جو اس زمانے میں ایک خاص مکتب خیال کے لئے اجنبی ہی تھا۔

بزرگوں کی عظمت جدید تعلیم کی نذر ہو ہی چکی تھی، رہ گئے ڈکنے یا بات کا ڈنکنے والا نام کو بھی کہیں نظر نہ آیا بس پھر رہ کیا تھی؟ کھلے بندوں جدت طرازیاں ہونے لگیں اور اُردو غریب کو کُند چھری سے ریتنے کا فتوائے عام ہو گیا! طبیعت میں جوانی کا زور، دماغ جدید علوم سے معمور، بازوؤں میں کام کرنے کی قوت! آتے ہی اخباری دنیا میں اس سرے سے اس سرے تک دھوم مچا دی۔ بڑے بڑے پرانے "کریزیئے اخبار نویس" چیخ اُٹھے! مگر "مولانا"[1] نے کسی کی ایک نہ مانی، اور عربیت کے زور شور سے وہ گولے برسائے کہ ایک مدت مدید تک انھیں کے الفاظ کی آواز بازگشت کے طور پر دشت و جبل سے آتی رہی!

مضمون خاص کے بدلے مقالہ، افتتاحیہ، تبصرہ
صحافت حاضرہ وغیرہ اور نظم کا رنگ:۔ ؎

برنگ شاخ گل بجلی کلائی
کلام قوم پہ خواص قیصرن قلستاں پہ

جہاں تہاں جاری ہو گیا اور ساری دنیا اسی رنگ میں مستور نظر آنے لگی آخر نظم و نثر کا یہ تموّج خدا کی زمین اور "زمیندار" کی پینڈہ پینڈہ سے گذرتا ہوا "بے آف بنگال" سے جا ٹکرایا۔ اور خاص کلکتہ میں جہاں عبدالغفور خاں نساخ کا جنم بھوم تھا۔ وہیں تھی ایک جلیل القدر ہستی۔ ایک لاثانی دماغ کے مالک ہمارے ایک محترم دوست کو برادعائے فضل و کمال و بہ شباہت ہوش و حواس بھی مختل کر دیا۔ یعنی آپ خاص اہل زبان ہونے اور دلّی کے روڑے کہلانے پر بھی خبر سے اسی رنگ میں رنگ گئے۔ چنانچہ "الہلال" چمکا۔ "البلاغ" نے دور دور پیام بری کی۔ اور با وصف ہمہ دانی خدا جانے کیا جاتی دنیا دیکھی کہ آپ نے بھی ادب اُردو کے نازنین تن بدن کو عربی اخبارات کے غیر مانوس ترجموں کے "بو جہل مواد" سے بالکل پکا پھوڑا کر ڈالا۔ بلکہ حسبی اللہ حسبی اللہ" بالکل ایک مکروہ ترین جذامی کی سی شکل پیدا کر دی۔

آپ کے کثیر التعداد مقلد ادھر ہی چل پڑے اور ملک میں بنگالی اُردو، پنجابی اُردو، پوربی اُردو، اور مدراسی اُردو کی دوکانیں جا بجا کھل گئیں۔ چنانچہ "اعتذار" شذرات اور خدا جانے کیا کیا بلا از قسم نودرات آپکی آزادانہ تجدید کی اب تک گواہیاں دینے کو موجود ہیں۔

(باقی)

[1] مولانا ظفر علی خاں۔

دھرم پال سرپرست ڈسکیشنہ بدایونی

پنڈت رام پرشاد بسمل

پنڈت رام پرشاد نام بسمل تخلص شاہجہاں پور کے ایک معزز برہمن خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ سنہ ۱۹ء کے قریب بیرن پوری کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ترک وطن کر کے شاہجہاں پور چلے آئے اور بسمل مرحوم کی نشو و نما شاہجہاں پور ہی میں ہوئی۔ آپ کے والد پنڈت مرلی دھر بھی اُردو شعر و ادب کا بڑا پاکیزہ مذاق رکھتے تھے اس لیے انھوں نے ابتدا میں بسمل کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا۔ اوائل عمری میں بسمل نے اُردو فارسی کی تکمیل کر لی اس کے بعد انگریزی اسکول میں داخل ہو گئے لیکن ہائی اسکول کا امتحان پاس نہ کر سکے لیکن انگریزی میں بھی اچھی دسترس رکھتے تھے۔ شاہجہاں پور اس زمانے میں شاعری کا گہوارہ تھا۔ منشی سوہن لال حقیر شاہجہاں پوری، ناظم شاہجہاں پوری جگدیش سہائے شاہجہاں پوری اور دل شاہجہاں پوری کے نغموں سے اُردو دنیا گونج رہی تھی اس لئے آپ منشی سوہن لال حقیر کے شاگرد ہو گئے۔ منشی سوہن لال حقیر اپنے زمانے کے اُردو اور فارسی کے جید عالم اور شاعر تھے۔ آپ کا فارسی دیوان طبع ہو چکا ہے۔ حضرت جگر بریلوی نے بھی آپ سے مشورۂ سخن کیا ہے بسمل کے سینے میں ایک دردمند دل تھا اس لئے ابتدا ہی سے وطن کی محبت میں سرشار تھے اور فرنگی کے راج کا بھارت سے خاتمہ چاہتے تھے کیونکہ آپ کا شروع ہی سے خیال تھا کہ وہ ملک جو غلامی کی زندگی بسر کرتے ہیں، ان کی کہیں بھی عزت نہیں کی جاتی۔

آپ شروع ہی سے انقلابی خیال کے انسان تھے اسی لئے آپ نے اپنے ملک کو آزاد کرانے کے لئے ہر ممکن کوشش کی۔ آزادی کی خاطر آپ نے ڈکیتیاں بھی ڈالیں لیکن کبھی کسی کو نقصان نہیں پہنچایا۔ مین پوری کے مشہور انقلابی لیڈر سری گیندن لال دیکشت کے ساتھ رہ کر آپ نے ملک اور قوم کی بڑی خدمت کی مین پوری سازش کیس میں انگریزی حکومت نے آپ کو بھی گرفتار کرنا چاہا لیکن آپ ہاتھ نہ آئے اور (Royal proclamation) کے بعد آپ شاہجہاں پور آ کر پھر ملک اور قوم کی خدمت میں لگ گئے۔

۹ر اگست ۱۹۲۵ء کو شام کے آٹھ بجے ٹرین ہردوئی سے لکھنؤ جا رہی تھی۔ اچانک کرانتی کاریوں نے کاکوری اور عالم نگر کے درمیان ۸۲ نمبر کے کھمبے کے قریب ٹرین کو روک لیا اور انگریزی گورنمنٹ کے خزانے کو لوٹ لیا لیکن کسی ہندوستانی کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچایا۔ ۲۵ر ستمبر ۱۹۲۵ء سے گرفتاریاں شروع ہوئیں اور پنڈت رام پرشاد بسمل بھی گرفتار ہوئے اور ان کے دوسرے ساتھی بھی پکڑے گئے۔ ڈیڑھ سال تک مقدمہ چلتا رہا، اور عدالت نے آپ کو پھانسی کی سزا دی، اور ۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو گورکھپور جیل میں آپ کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ کاکوری سازش کیس کی پیروی اُردو کے مشہور شاعر پنڈت آنند نرائن ملا کے والد جگت نرائن ملا گورنمنٹ کی طرف سے کر رہے تھے۔

پھانسی سے ایک دن پہلے بسمل اپنی والدہ سے ملے اور اُن کو دیکھ کر رو پڑے کیونکہ بسمل کا خیال تھا کہ اُن کی والدہ کا مدد کرنے والا اب کوئی نہیں ہے۔ ماں نے کڑک کر کہا کہ ساری زندگی ملک کے لئے آنسو بہاتے رہے اب آخری وقت میرے لئے روتے ہو۔ بسمل نے جواب دیا کہ اگر گھی کو آگ کے پاس لایا جائے تو اُس کا پگھلنا ضروری ہے۔

۱۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کی صبح سندھیا سے فارغ ہو کر فوراً اپنی والدہ کو ایک خط لکھا اور اس میں اپنے ہم وطنوں کے نام ایک پیغام بھیجا اور پھانسی کے انتظار میں کال کوٹھری میں بیٹھ گئے۔ جیسے ہی جیل کے افسر آپ کو پھانسی کے لئے بلا دینے کے لئے آئے تو بندے ماترم اور بھارت ماتا زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے فوراً چل دیئے چلتے وقت انھوں نے کہا۔ ؎

مالک تری رضا رہے اور تو ہی تو رہے
باقی نہ میں رہوں نہ مری آرزو رہے
جب تک کہ تن میں جان رگوں میں لہو رہے
تیرا ہی ذکر یار تری جستجو رہے

پھانسی کے دروازے پر پہنچکر انھوں نے کہا:-

"I wish the downfall of British Empire"

اس کے بعد پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو کر کہا۔ ؎

اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ
ایک مٹ جانے کی حسرت بس دل بسمل میں ہے

اُردو ہی ہندوستان کی وہ ترقی یافتہ زبان ہے جس کے سیکڑوں شاعر پھانسی کے تختے پر لٹکا دیئے گئے آزادی کی لڑائی میں اس زبان نے بڑا کام کیا ہے۔ ہم کو اس زبان کو زندہ رکھنا ہے کیونکہ یہ زبان رام پرشاد بسمل، اشفاق اللہ حسرت، راجیندر لہری، لالا لاجپت رائے اور سردار بھگت سنگھ جیسے وطن پرست شہیدوں کی زبان ہے۔ عالی جناب آل احمد سرور نے اپنی نظم اُردو میں کیا خوب فرمایا ہے۔ ؎

یہ وہ زباں ہے کہ جس نے زنداں کی تیرگی میں دیئے جلائے
یہ وہ زباں ہے کہ جس کے شعلوں سے جل گئے پھانسیوں کے سائے
فرازِ دار و رسن سے بھی ہم نے سرفروشی کے گیت گائے
کہاں ہے کس بنے ہم اپنے پیارے وطن پر یوں بے وطن ہوئے
زباں چھن جائے گی ہمارے دہن سے ہم بے سخن ہوئے
ہم آج بھی گل کی طرح دل کے ستارہ پیرہن ہوئے

پنڈت رام پرشاد بسمل کی مشہور انقلابی غزل ملاحظہ فرمائیے۔ جسے سردار بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی اپنے مقدمہ کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے کمرۂ عدالت میں گایا کرتے تھے :-

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
رہ روِ راہِ محبت رہ نہ جانا راہ میں
لذتِ صحرا نوردی دورئ منزل میں ہے
یوں کھڑا مقتل میں قاتل کہہ رہا تھا بار بار
کیا تمنائے شہادت بھی کسی کے دل میں ہے

لسانی اقلیتی کمشنر سے انجمن ترقی اردو راجستھان کے وفد کی ملاقات

۲۶ دسمبر ۶۲ء کو انجمن ترقی اردو راجستھان کا وفد زیر قیادت الطاف احمد صاحب خیری صدر انجمن ترقی اردو راجستھان، لسانی اقلیتی اسسٹنٹ کمشنر (الٰہ آباد) شری ڈی۔ این۔ باجپئی سے جے پور میں ملا۔ ارکان وفد میں احترام الدین احمد صاحب شاغل، ڈاکٹر سردار رام سنگھ خازن، منشی دامودر لال ماتھر، گلاب خاں صاحب نائب صدر انجمن نرایتہ، فرید بخش صاحب نمائندہ انجمن مکرانہ، ظہور الدین صاحب نمائندہ انجمن باسنی، پیرجی عبدالصمد فاروقی نمائندہ جھنجھنوں شامل تھے۔ اسسٹنٹ کمشنر صاحب مذکور کے علاوہ اسپیشل آفیسر صاحب لسانی اقلیات راجستھان اور ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب تعلیمات ریاست راجستھان بھی موجود تھے، نہایت خوش گوار فضا میں حسب ذیل موضوعات پر تبادلہ خیالات ہوا۔ اور رفع شکایات کا یقین دلایا گیا۔

تعلیم وفد نے تسلیم کیا کہ باوجود صاف حکم گورنمنٹ ہند اور گورنمنٹ راجستھان جولائی ۱۹۵۹ء سے آج تک مقررہ شرائط (۴۰ طلبہ فی کلاس یا ۱۲۰ طلبہ فی اسکول) کی موجودگی کے کسی ایک اسکول میں بھی ابتدائی درجات (از درجہ اول تا درجہ پنجم) میں پورے مضامین اردو میں ۳½ سال گزر جانے کے باوجود جاری نہیں کئے گئے نہ ذریعہ تعلیم کسی ایک بھی اسکول میں اردو کو قرار دیا گیا نہ نصاب میں بجز ریڈروں کے کسی دوسرے مضمون کی کتاب نامزد کی گئی، اگرچہ گورنمنٹ راجستھان ۱۹۵۹ء ہی میں یہ حکم دے چکی ہے کہ اگر راجستھان میں اردو کی کتابیں نہ ہوں تو قریبی ریاستوں سے لے لی جائیں۔ وفد نے بطور نمونہ ایک مختصر سا گوشوارہ بھی بتیس اسکولوں کا ایسا پیش کیا جن میں زیادہ تر ہر دو شرائط پوری ہوتی ہیں اور بہت سی جگہ سو فی صد طلبہ ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہی ہے اور بلحاظ تعداد بہت سے اسکولوں میں طلبہ کی مجموعی تعداد سو سے اوپر ہے بلکہ ایک میں تو چار سو سے بھی زائد طلبہ ہیں۔ اگر انجمن ہٰذا کی تمام شاخوں سے اعداد و شمار وقت پر آجاتے تو ایسے اسکولوں کی تعداد کئی سو ہوتی تاہم اس مختصر گوشوارے کی نقل ہر سہ افسران نے طلب کی ہے اور امید ہے کہ ان میں آئندہ سیشن سے انتظام ہو جائے گا۔ اسی ذیل میں یہ بات بھی منجانب افسران کہی گئی کہ اب درخواست داخلہ میں جس کا نام گوشوارہ ہے یہ فقرہ رکھ دیا گیا ہے کہ طالب علم کا سرپرست کس زبان میں تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔

ظاہر ہے کہ دستور ہند کی رو سے اور احکام مجریہ کی رو سے درجہ اول سے درجہ پنجم تک بچے کی مادری زبان میں تعلیم دی جانی چاہئے پھر اگر خود سرپرست ہی اس بات کو نہ سمجھیں کہ مادری زبان کی تعلیم کے کس قدر فائدے ہیں تو اس کا کیا علاج ہے۔ اس لئے اردو والوں کو اچھی طرح سوچ سمجھ کر یہ فارم بھرنا یا بھروانا چاہئے۔ کسی کے بہکانے یا غلط ترغیب دینے کا اثر نہ لینا چاہئے۔ اسی طرح یہ سوال بھی پیدا ہوا کہ ایک رجسٹر ہر اسکول میں رکھوا دیا گیا ہے کہ کس زبان میں بچہ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وفد کا کہنا تھا کہ ایسا رجسٹر مرتب نہیں کیا جا رہا ہے مگر ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب نے یقین دلایا کہ ایسے رجسٹر رکھوا دئے گئے ہیں۔ بہر حال تعلیمی زبان کا معاملہ اب سرپرستان کی مرضی اور دور اندیشی پر منحصر ہے۔ یہ بات کہ بچے اردو پڑھے گا تو ہندی میں کمزور رہ جائے گا اور سرکاری زبان سے ناواقفیت باعث نقصان ہوگی قطعاً بے بنیاد غلط فہمی ہے۔ اس لئے کہ درجہ سوم سے ہندی کی تعلیم راجستھان میں لازمی ہے۔ پھر کمزوری کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ وفد نے ظاہر کیا کہ کئی برس سے مادری زبان کی تعلیم کے لئے شرائط پوری کرتے ہوئے درخواستیں دی جاتی ہیں مگر ماتحت افسران نہ توجہ کرتے ہیں نہ جواب دیتے ہیں مثلاً نرایتہ قصبہ کی ڈھانی بھرتولاؤ کا پرائمری اسکول جس میں کل ۷۰ طلبہ ہیں اور سب کی مادری زبان اردو ہے۔ درخواست پر درخواست دی جاتی ہیں مگر متعلقہ افسر اردو جاری نہیں ہونے دیتے۔ بعض جگہ ہیڈ ماسٹر اردو کا ٹیچر نہ ہونے کا عذر کرتے ہیں، در آنحالیکہ ایک بڑی تعداد اسی انسپکٹری میں ایسے ٹیچروں کی موجود ہوتی ہے جو اردو پڑھانے کے اہل ہیں مگر انسپکٹری حلقہ سے ان کو ایسی جگہ بدل دیا گیا ہے جہاں اردو نہیں ہو سکتی اور جہاں اردو جاری جاتی ہے وہاں غیر اردو داں مامور کر دئے جاتے ہیں اس طرح طلبہ اردو چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ چنانچہ اپنے قول کے ثبوت میں وفد نے ضلع جے پور، ناگور، سوجت ضلع پالی اور ضلع جھنجھنوں میں اردو کے کوالیفائڈ اساتذہ اردو کی ایک فہرست بطور نمونہ پیش کی یہ فہرست بطور نمونہ ہے اور بہت مختصر ہے۔

اسی سلسلہ میں یہ بھی سوال پیدا ہوا کہ جامعہ اردو کے امتحانات پاس شدہ اساتذہ کو گریڈ نہیں دئے جاتے اور باوجود راجستھان ایجوکیشن بورڈ اور راجستھان یونیورسٹی کے ان امتحانات کو تسلیم کر لینے کے ملازمت نہیں دی جاتی۔ بعد بحث و مباحثہ قرار پایا کہ اہلیت ملازمت کے لئے مثل ہندی وغیرہ کے امتحانات کے ان امتحانات کی بابت بھی حکومت راجستھان کا حکم ہونا ضروری ہے لہٰذا اس معاملہ کو انجمن راجستھان جداگانہ پیش کرے گی۔

وفد نے کہا کہ معاینہ کنندہ افسر اپنے معائنوں میں اردو کی تعلیم کی بابت باوجود اردو تعلیم جاری ہونے کے مطلق ذکر نہیں کرتے۔ اسی طرح پروگرام میں اردو کے اوقات تعلیم عام طور پر درج نہیں کئے جاتے اور باوجود شرائط مذکور پوری ہونے کے وہ حکم گورنمنٹ کے مطابق تعلیم اردو پر توجہ نہیں کرتے بلکہ ہندی پڑھنے کی ترغیب دیتے اور اردو سے کنارہ کش ہو جانے کے مواقع پیدا کر دیتے ہیں۔

وفد نے کہا کہ یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ اردو میں مختلف مقررہ مضامین کی کتابیں نایاب ہیں۔ اپنے اس بیان کے ثبوت میں اس نے جملہ کلاسوں کے جملہ مضامین کی اردو کی نصابی کتب طبع کردہ "انوار بک ڈپو لکھنؤ" پیش کیں قرار پایا کہ دفتر ڈائرکٹر صاحب سے کتب نصاب نامزد کر کے سلیبس میں شائع کی جائیں۔ اسی طرح اسکولوں کی لائبریریوں میں جو اب تک اردو کی مختلف قسم کی کتابیں اس لئے نہیں خریدی جاتی ہیں کہ وہ منجانب ڈائرکٹر صاحب منظور ہو کر "اپروڈ لسٹ" میں درج نہیں ہوتیں اس لئے ہیڈ ماسٹر صاحبان نہایت آسانی سے عذر کر دیتے ہیں کہ "اپروڈ لسٹ" میں اردو کی کتاب نہیں ہے اس لئے نہیں خریدی جا سکتی، لہٰذا اب اردو کی قابل خرید کتابیں

لسٹ مذکور میں درج ہو کر اعلان کیا جائے۔

وفد نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ جہاں جہاں اُردو والوں کی معقول تعداد ہے۔ یا متوقع ہے۔ ان وارڈوں میں ایک یا زائد پرائمری اسکول ایسے نامزد کر دئے جائیں جو اُردو ذریعۂ تعلیم کے ہوں۔ اسپیشل آفیسر صاحب اور ڈپٹی ڈائرکٹر صاحب نے اس تجویز پر غور کرنے کا اقرار کیا۔

وفد نے یہ بھی باور کرایا کہ جب سے پرائمری اسکولوں کا تعلق پنچایتوں سے ہوا ہے، مزید دشواریاں پیدا ہو گئی ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں وفد نے یہ بھی ظاہر کیا کہ ۸ر ستمبر ۷۱ء کو راجستھان یونی ورسٹی سے انجمن ہٰذا نے درخواست کی تھی کہ کم از کم صرف جے پور ہی میں اُردو کے ایم۔ اے کے کلاس مہاراجہ کالج میں جاری کئے جائیں۔ یونیورسٹی نے یہ شرط عائد کی کہ ۲۰ طلبہ ہوں تو غور کیا جائے لہٰذا انجمن نے ایسے ۲۶ طلبہ کی درخواستیں پیش کیں۔ مگر آج ایک سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ اور پوسٹ گریجویٹ کلاسوں کی تعلیم سے اُردو والے محروم ہیں۔

اُردو کی درخواستیں نقل حکم اور دستاویزات

جیسا کہ گورنمنٹ راجستھان نے نومبر ۷۲ء میں صاف حکم جاری کر دیا ہے کہ تمام دفاتر و محکمات میں اُردو کی درخواست لینے سے انکار نہیں کیا جائے گا۔ وفد نے کہا کہ یہ آسانی عدالتوں کے لئے بھی ہونی چاہیئے۔ اس پہلو پر کافی دیر تبادلۂ خیالات ہوا کیونکہ جو عدالتیں ہائی کورٹ کے ماتحت ہیں وہ ہائی کورٹ کے حکم ہی کی تعمیل کر سکتی ہیں۔ حکومت کے ایسے احکام ان کے لئے واجب التعمیل نہیں ہیں اور ہائیکورٹ اس وقت تک حکم نہیں دے سکتی جب تک کہ ایسا قانون نہ ہو جائے۔ وفد نے دستورِ ہند کی دفعہ ۳۵۰ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ یہ تو ہر شخص کو حق ہے کہ خود کسی بھی زبان میں اپنی داد رسی کی درخواست پیش کرے اسی درمیان میں دیگر محکمات و دفاتر کے متعلق جائزے کا سوال ہوا کہ جو ہائی کورٹ کے ماتحت نہیں ہیں، تو اسپیشل آفیسر صاحب نے بتایا کہ گورنمنٹ نے ذریعہ سرکلر محکمات سے دریافت کیا ہے کہ اُردو کی کتنی درخواستیں پیش ہوئیں۔ تو وفد نے بتایا کہ ہمارے علم میں صرف ایک واقعہ تو کلکٹری جے پور کا ہے کہ ایک درخواست اُردو میں مردم شماری کے سلسلے میں متعلقہ ملازم نے لینے سے انکار کیا تھا جس کی وقت پر اطلاع دی گئی تھی اور اس پر کارروائی بھی ہوئی اور دوسرا سب انسپکٹر پولیس تھانہ رام گنج کا ہے کہ جس نے ایک چوری کی رپورٹ جو اُردو میں لکھی ہوئی تھی لینے سے انکار کیا تھا۔ جس میں لطف کی بات یہ ہے کہ سب انسپکٹر نے جو تحریری جواب دیا ہے کہ ہندی میں رپورٹ کی جائے وہ اُردو میں لکھا ہے اور اُردو ہی میں اپنے دستخط کئے ہیں۔ ہاں اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے بتایا کہ ہم نے بڑے کارروائی حکومت کو یہ شکایت بھیجی ہے کہ اسپیشل آفیسر صاحب نے وعدہ کیا کہ اس پر ضرور کارروائی ہوگی وفد نے صاف طور پر اعتراف کیا کہ خود اہل معاملہ اپنے ذاتی مفاد کے پیش نظر ہندی میں درخواست دیتے ہیں اور کوئی شکایت انجمن کو وصول نہیں ہوئی۔

نقل حکموں کی بابت یہ عمل ضرور ہے کہ اب اُردو کے کاغذات کی نقول اُردو ہی میں ملتی ہیں۔ مگر منشی دامودر لال رکن وفد نے بتایا کہ سب ڈویژن میں جو اُردو کی نقلیں دی جاتی ہیں وہ کسی غیر ملازم اُردو داں سے کرا کر دی جاتی ہیں چونکہ سالہا سال ریاست جے پور، ٹونک اور دھول پور کی سرکاری زبان سنہ ۴۹ء کے بعد تک اُردو ہی ہے اس لئے بہت کچھ پچھلا ریکارڈ اُردو میں ہے۔ اس لئے جہاں جہاں یہ صورت ہے وہاں کم از کم ایک اُردو داں کلرک ضرور مامور ہونا چاہیئے۔ وفد نے یہ بھی کہا کہ جو رجسٹرار اُردو داں ہیں ان کو تو اُردو کی دستاویزات کی نقل ہندی میں طلب نہ کرنی چاہیئے۔ بہرحال یہ معاملہ خود اُردو والوں کے ذاتی مفاد یا تحفظ زبان پر منحصر ہے جیسا بھی وہ چاہیں۔ البتہ گورنمنٹ اپنے حکم کی تعمیل کرانے کو آمادہ ہے بشرطیکہ کوئی شکایت پیش آئے۔ اُردو کے ریکارڈ کی اُردو میں نقل دئے جانے کا حکم گورنمنٹ راجستھان نے ۲۹ر جولائی ۷۰ء کو جاری کیا ہے۔

وفد نے دعویٰ کیا کہ حکومت راجستھان کے پریس نوٹ نشر شدہ و حکم مورخہ ۱۱ر دسمبر ۱۹۷۰ء (نمبر 3(1) -15635 /Ed/a/59) راجستھان گزٹ مورخہ ۱۶ر اگست ۱۹۷۰ء میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کی اب تک تعمیل نہیں ہوئی ہے۔ کوئی قانون، ضابطہ، قواعد، اعلان یا اشتہار ایسا نہیں بتایا جا سکتا کہ جو اُردو میں شائع کیا گیا ہو۔ حتیٰ کہ جے کمیٹی کے قواعد و اعلانات تک کہ جو خود حکومت راجستھان کے جاری کردہ ہوتے ہیں، اُردو میں شائع نہیں ہوئے۔ یہی حال اعلانات متعلق اوقاف و کوآپریٹیو سوسائٹی وغیرہ کا ہے۔ لہٰذا اسپیشل آفیسر صاحب نے یہ بات نوٹ کی اور اسسٹنٹ کمشنر صاحب نے قواعد وغیرہ متعلق حج کی نقل طلب کی ہے جو ہندی میں ہو یا انگریزی میں۔

ساہتیہ اکیڈمی راجستھان

وفد نے احتجاج کیا کہ ساہتیہ اکیڈمی راجستھان جس کے دستور میں ہندی، اُردو، راجستھانی اور سنسکرت کے ادب کی ترقی موجود ہے اور اس کے لئے ۱½ لاکھ روپیہ سالانہ سرکاری خزانے سے ملتا ہے اور اس روپے میں ان لوگوں کے ٹیکسوں سے وصول شدہ رقم بھی ہے، جن کی مادری زبان اُردو ہے اور اکیڈمی کے دستور میں اُردو ادب کی ترقی بھی شامل ہے، مگر آج تک اُردو پر ایک پائی اس نے خرچ نہیں کی۔ حد تو یہ ہے کہ اُردو کی تحریر تک لینے سے تحریری طور پر انکاری ہے۔ یہ کہتے ہوئے کہ ہمارے یہاں کوئی اُردو کا کلرک نہیں ہے۔ لہٰذا وفد نے پُرزور مطالبہ کیا کہ اکیڈمی کا سلوک سب زبانوں کے ساتھ یکساں ہونا چاہیئے۔

کلیم الدین عثمانی
اسسٹنٹ سکریٹری انجمن ترقی اُردو راجستھان

[illegible]

بقیہ: پنڈت رام پرشاد بسمل

وقت آنے پر بتا دیں گے تجھے اے آسماں
ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اے شہیدِ ملک و ملت تیرے جذبوں پر نثار
تیری قربانی کا چرچا غیر کی محفل میں ہے

بسمل مرحوم کی چند غزلیں ملاحظہ فرمائیے :-

مٹ گیا جب مٹنے والا پھر سلام آیا تو کیا
دل کی بربادی کے بعد اُن کا پیام آیا تو کیا
کاش اپنی زندگی میں ہم یہ منظر دیکھتے
یوں سرِ تربت کوئی محشر خرام آیا تو کیا
مٹ گئیں ساری امیدیں مٹ گئے سارے خیال
اُس گھڑی گر نامہ بر لے کر پیام آیا تو کیا
اے دلِ ناکام مٹ جا کوچۂ دلدار میں
پھر مری ناکامیوں کے بعد کام آیا تو کیا
آخری شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبح دم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

دیکھنا ہے کس قدر دم خنجرِ قاتل میں ہے
اب بھی یہ ارمان یہ حسرت دلِ بسمل میں ہے
غیر کے آگے نہ پوچھو اس میں ہے اک خاص راز
پھر بتا دیں گے تمہیں جو کچھ ہمارے دل میں ہے
کھینچ کر لائی ہے سب کو قتل ہونے کی امید
عاشقوں کا آج جمگھٹ کوچۂ قاتل میں ہے
پھرتے ہو کیوں ہاتھ میں چاروں طرف خنجر لئے
آج ہے یہ کیا ارادہ آج یہ کیا دل میں ہے
ایک سے کرتا نہیں کیوں دوسرا کچھ بات چیت
دیکھتا ہوں میں جسے وہ چپ تری محفل میں ہے
ان پہ آفت آئے گی اک روز مر ہی جائیں گے
وہ تو دنیا میں نہیں جو کوچۂ قاتل میں ہے
ایک جانب ہے مسیحا ایک جانب ہے قضا
کشمکش میں پڑ گیا ہوں جان کس مشکل میں ہے
زخم کھا کر بھی اُسے ہے زخم کھانے کی ہوس
حوصلہ کتنا تڑپنے کا ترے بسمل میں ہے

آؤ ہم تم بھائیو! دل کھول کر ماتم کریں
ہم شہیدانِ وطن کی بے کسی کا غم کریں
ساتھ والوں نے خوشی سے جان دے دی ملک پر
رہ گئے اس فکر میں بیٹھے ہوئے کیا ہم کریں
راہِ حق میں مر مٹیں غم زندگی کا ان کو کیا
جیتے جی ہم مر گئے جینے کا اپنے غم کریں
ماننے کی جو نہ ہو وہ بات کیوں کر مان لیں
غیر ممکن ہم عدو کے سامنے سر خم کریں
آپ ہی خلوت میں کاٹیں اپنے بھائی کا گلا
آپ ہی پھر بیٹھ کر احباب میں ماتم کریں
جب یہ حالت ہے ہمارے ملک کے افراد کی
ظلم سے اغیار کے پھر چشم کیا پُرنم کریں
خوب روئے آپ تو حل بیٹھنے سے ہوتا ہے کیا
کام ان کا کیا کریں جو آہ و نالہ کم کریں

غیر حالت ہے مری دیکھنے آئے کوئی
کون ہے قصۂ غم جس کو سنائے کوئی
رو کے [illegible] یہ کہتا ہے لے بیچارہ آیا
ہم کو کمزور سمجھ کر نہ ستائے کوئی
دودھ بچپن میں سپوتوں کو پلایا ہم نے
اب ضعیفی میں ذرا آ کے بچائے کوئی
باپ کو بیٹے سے ہے بھائی کو بھائی سے نفاق
رنج آپس کے جو ہیں اُن کو مٹائے کوئی
خوابِ غفلت میں پڑے سوتے ہیں جو اہلِ وطن
ہوش میں لائے کوئی ان کو جگائے کوئی
یہ زمانے کی ہے خوبی یہ مقدر کی ہے بات
چین سے سوئے کوئی چین نہ پائے کوئی
پھر نہ بسمل رہے دنیا میں کوئی اے بسمل
پھر نہ آزار زمانے کے اٹھائے کوئی

رام پرشاد بسمل کے ایک غیر فانی شعر پر منشی گوپی ناتھ امن لکھنوی کی تضمین ملاحظہ فرمائیے :-

شہیدانِ وطن کی گور سے آواز آتی ہے
وہی ہم سے ملے آکر جو اپنی جان پر کھیلے
اُدھر دنیا کی راحت ہے اِدھر لطفِ شہادت ہے
یہ سودا تیرے آگے ہے جو تو چاہے وہی لے لے
یہی جنسِ گراں قیمت، سہولت سے نہیں ملتی
جو آزادی کا خواہاں ہو وہ پہلے اپنا سر دے لے
ہزاروں ہی سلام ایسے فدائے ملک و ملت پر
فلاحِ قوم کی خاطر جو پیہم سختیاں جھیلے
گئے جیلوں میں قیدی اور چڑھے پھانسی پہ ہنس ہنس کر
شہادت کا سبق لینا ہے جس جس کو وہ ان سے لے
بقولِ بسمل[1] مرحوم کا یہ ہر زباں پر ہے
"شہیدوں کی چتاؤں پر جڑیں گے ہر برس میلے
وطن پر مرنے والوں کے یہی باقی نشاں ہوں گے"

---

[1] رام پرشاد بسمل۔

ضروری اعلان

براہِ مہربانی خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔ منیجر

ضیاء احمد بدایونی

تبصرے

سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات

تالیف: پروفیسر خلیق احمد نظامی (شعبۂ تاریخ مسلم یونیورسٹی)
ناشر: ندوۃ المصنفین، اردو بازار، جامع مسجد۔ دہلی۔
حجم: ۴۰۰ صفحات۔ قیمت آٹھ اور نو روپے۔

تاریخ کی کتابیں جو عموماً لکھی گئی ہیں وہ سلاطین کی معرکہ آرائیوں اور کشور کشائیوں کی داستانوں سے زیادہ نہیں۔ کسی عہد کی مذہبی، علمی، تعلیمی، سماجی سرگرمیوں کا اگر ذکر آبھی گیا ہے تو محض ثانوی حیثیت سے اور ناکافی طور پر۔ ان حالات میں پروفیسر نظامی صاحب کی یہ گراں مایہ تالیف ہماری زبان میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ موصوف کی وسعتِ مطالعہ، دقتِ نظر اور متانتِ اسلوب کے متعلق دو رائیں نہیں ہوسکتیں، وہ جواں سال ہونے کے ساتھ عموماً پیرانہ اصابت رائے کے مالک ہیں۔ سلاطین دہلی کے مذہبی رجحانات پر فیصلہ کن بحث کی خاطر انھوں نے تواریخ کے علاوہ علماء اور صلحاء کے تذکروں، ملفوظات، مکتوبات غرض ہر ممکن ماخذ سے کام لیا ہے۔ جس عہد پر وہ لکھ رہے ہیں اُس میں مذہب کو بڑی اہمیت حاصل تھی، اور سلاطین کے مذہبی اندازِ نظر کا اثر ان کی سیاست پر پڑنا ناگزیر تھا، اس لئے اس قسم کی تالیف کے بغیر عہد مذکور کی تاریخ کا مطالعہ ادھورا رہتا۔ کتاب کے شروع میں ایک فاضلانہ اور محققانہ مقدمہ ہے جس کے ذیلی عنوانات کے تحت فاضل مولف نے بڑے مدلل انداز میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد غلام، خلجی، تغلق اور لودی بادشاہوں کے مذہبی رجحانات دکھائے ہیں۔ کتاب کے آخر میں عربی، فارسی، اردو، انگریزی مآخذ (جن سے مولف نے استشہاد کیا ہے) کی فہرست دے دی ہے۔ اتنی ضخیم کتاب میں کسی رائے سے اختلاف چنداں مستبعد نہیں۔ مثلاً علاء الدین خلجی کے "بہیمانہ" مظالم کے ہوتے ہوئے اس کی "دین داری" سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ (صفحہ ۲۰۰) اسی طرح محمد تغلق کے بزرگان چشت کے ساتھ تذلیل آمیز برتاؤ کے پیش نظر سلطان کی توجیہ محلِ نظر معلوم ہوتی ہے (صفحہ ۳۲۴) سلطان اپنے خیال میں خلفائے راشدینؓ کے مبارک دور کی خصوصیات واپس لانا چاہتا تھا۔ لیکن خود اس کا طرز عمل عدلِ فاروقی اور حکمتِ مرتضوی سے کوسوں دور تھا۔ بہرحال یہ فاضلانہ تالیف، نہایت بیش قیمت مواد اور مباحث پر مشتمل ہے جس پر ندوۃ المصنفین دہلی مبارکباد کا مستحق ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ تاریخی مسائل کے باوجود کتاب ادبی لطافت کی مایہ دار ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر جی نہیں مانتا۔

ہدایت الاسلام حصۂ سوم

از مولانا نسیم بستوی صاحب۔
ناشر: مکتبہ لطیفیہ، براؤں شریف، پوسٹ سکھوئی، ضلع بستی۔
قیمت۔ پچاس نئے پیسے۔

اس کتابچے میں سوال وجواب کی شکل میں نماز کے مسائل و احکام عام فہم اور آسان طریقے سے دیے گئے ہیں۔ یہ خدمتِ دین کے ساتھ ضمناً زبان کی بھی خدمت ہے اور ہر طرح قابل قدر ہے اس میں کہیں کہیں بعض مشکل اصطلاحات بھی آگئی ہیں۔ مثلاً خروج بصنعہٖ (جس سے مراد نمازی کا اپنے عمل یا ارادے سے نماز سے باہر آنا ہے)۔ تعدیل ارکان۔ قعدہ۔ تعوذ۔ تسمیہ، ثنا، دعائے ماثورہ۔ اگر وہیں یا فٹ نوٹ میں ان کی تشریح کر دی جاتی تو اچھا تھا۔

فاضل مصنف نے خطبۂ جمعہ اردو میں پڑھنے کو ناجائز کہا ہے۔ حالانکہ خطبے کا مقصد اگر عبادت کے ساتھ تذکیر (وعظ و پند) بھی ہے تو مادری زبان میں ہدایات کا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے خطبے کے سلسلے میں ہے ویذکرالناس یعنی آپ لوگوں کو نصیحت فرماتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ مادری زبان کے بغیر نصیحت کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا بہتر ہو کہ اردو کے ساتھ خطبۂ ماثورہ کی عبارت بھی خطیب ادا کرے تاکہ دونوں کی رعایت رہے۔

تصویر کائنات

مرتبہ خضر برنی۔
ملنے کا پتا۔ خضر بک ڈپو۔ بلند شہر۔
قیمت۔ ایک روپیہ۔

اس میں مسلمان اور ہندو درویشوں مثلاً بابا فرید، امیر خسرو، گرو نانک، سورداس، تلسی داس وغیرہ کے حکیمانہ دوہے، منظوم ترجمے کے ساتھ جمع کر دئے گئے ہیں۔ شروع میں اُن کے مصنفین کا مختصر تعارف ہے۔ ترجمے میں فنی اغلاط زیادہ ہیں۔ بعض مصرعے بھی وزن سے خارج ہیں۔ کاغذ وکتابت خراب ہے۔

[illegible]